تبصرۂ کتب

Man and Destiny ، عبدالرشید صدیقی، ناشر: اسلامک فاؤنڈیشن، مارک فیلڈ کانفرنس سنٹر، رَیٹبی لین، مارک فیلڈ، لیسٹر شائر LE69-9SY، برطانیہ۔ صفحات ۱۲۳، قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر نکلسن کا ترجمہ اسرار خودی (۱۹۲۰ء) انگریزی دنیا میں اقبال کے تعارف کا سب سے پہلا حوالہ ثابت ہوا۔ اقبال کی زندگی میں اقبالیات سے متعلق انگریزی میں متفرق مضامین کے علاوہ گنی چنی کتابیں ہی شائع ہوئیں، جن میں کلامِ اقبال کے بعض انگریزی تراجم بھی شامل ہیں، مثلاً نواب ذوالفقار علی خاں کی کتاب *A Voice from the East* (۱۹۲۲ء)، شیخ اکبر علی کی *Iqbal: His Poetry and Message* (۱۹۳۲ء)، خواجہ غلام السیدین کی *Iqbal's Educational Philosophy* (۱۹۳۸ء)۔ اگلے دس سالوں میں اقبال پر عبداللہ انور بیگ، بشیر احمد ڈار اور ڈاکٹر سنہا کی کتابیں منظر عام پر آئیں اور اقبال کے منتخب اُردو کلام کا انگریزی ترجمہ *Poems of Iqbal* وکٹر کیرنن نے ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شائع کیا، چند سال بعد اس کی دوسری اشاعت جان مرے، لندن سے عمل میں آئی۔

انگریزی میں جو کتابیں برعظیم میں چھپتی تھیں، اُن کی بہت کم تعداد انگلستان پہنچتی ہوگی۔ اس صورتِ حال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۲۰ء سے قیامِ پاکستان تک کے عرصے میں، انگریزی خواں طبقے کے لیے نکلسن کے ترجمہ اسرار خودی اور کیرنن کے منتخب کلام کے ترجمے کے سوا اور کوئی کتاب میسر نہ تھی، خاص طور پر انگلستان میں مقیم قارئین کے لیے۔ البتہ اس عرصے میں اخبارات و رسائل میں اقبال پر گنتی کے چند مضامین چھپے ہوں گے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں تاریخ، سیاسیات، اسلامی فکر اور برعظیم کے مطالعات کے ضمن میں انگریزی اور امریکی اساتذۂ جامعات کی تحریروں اور بعض دائرہ معارف (انسائی کلوپیڈیا) قسم کی کتابوں میں اقبال کا ذکر ضرور ملتا ہے بایں ہمہ انگلستان میں مقیم مسلمانوں کی نوجوان نسل، اقبال برعظیم کے دیگر مسلمان زعما اور مشاہیر سے بے بہرہ ہی رہی اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیوں کہ برطانوی تعلیمی اداروں کے تعلیم یافتہ نوجوان، جن اداروں میں زیرِ تعلیم رہے، وہاں مسلم مشاہیر کو متعارف کرانے کا کوئی اہتمام نہیں

تھا۔ زیرِنظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ مصنف دیباچے میں اس کتاب کی تصنیف کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ اقبال پر نامور مصنفین نے سیکڑوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں، اس کے باوجود عام قارئین خصوصاً مغرب کی نوجوان نسل کے لیے اس کتاب کی ضرورت تھی۔ کیونکہ یورپ میں پلے بڑھے مسلمان نوجوان فکرِاسلامی میں اقبال کے کارنامے سے بے خبر ہیں۔ میں نے انھی لوگوں کے لیے اقبال کے فلسفۂ خودی اور مردِکامل کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد نے کتاب کے تفصیلی فاضلانہ تعارف میں اقبال کی شاعری، فکر، خطباتِ مدراس، خطبۂ الٰہ آباد اور اقبال کے تصورِ اسلام کی بڑی عمدگی سے وضاحت کی ہے۔ انھوں نے فکرِاقبال پر بحث کرتے ہوئے اپنی بات جس نکتے پر ختم کی ہے، اس کی وضاحت علامہ اقبال ایک مصرعے میں اس طرح کر چکے ہیں۔ ع

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

دیباچہ نگار نے مصنف کی زیرِنظر کاوش کو سراہتے ہوئے توقع ظاہر کی ہے کہ یہ خوب صورت کتاب نئی مسلم نسل کو اقبال کے پیغام کی بہتر تفہیم میں مدد دے گی اور اس سے مسلم نشاتِ ثانیہ کے لیے دورِحاضر کی مجموعی کاوشوں کو بھی آسانی سے سمجھا جاسکے گا۔

کتاب کا ضمنی عنوان ہے:

Some Reflections on Iqbal's Concepts of Khudi and Perfect Man

چنانچہ بنیادی طور پر یہ کتاب اقبال کے صرف دو تصورات (فلسفۂ خودی اور تصورِ مردِکامل) کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے۔ مصنف نے فلسفۂ خودی کی تشریح سے پہلے، اقبال کے مجموعی فکر وفلسفے کی وضاحت کی ہے، جس میں اُمتِ مسلمہ کی حالتِ زار، فکرِاقبال کی نشوونما، انسان، کائنات اور خدا کا تصور اور باہمی ربط، زمان ومکاں، فرد اور معاشرہ اور اقبال کے سیاسی فکر جیسے پہلوؤں پر کلام کرتے ہوئے اقبال کی شاعری اور نثر کی مدد سے اُن کا ربط اقبال کے فلسفۂ خودی اور تصورِ مردِکامل سے قائم کیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اقبال کی فلسفیانہ فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خودی اور مردِکامل کے تصورات اقبال کی فلسفیانہ فکر کے دو کلیدی اجزا ہیں۔

خودی کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے کہا ہے کہ اقبال نے خودی کا لفظ قدرے تامّل کے بعد اختیار کیا ہے اور پھر کوشش یہ کی ہے کہ ''خودی'' کے منفی مفاہیم سے بچتے ہوئے اسے عرفانِ ذات (self-realization) کے تناظر میں پیش کیا جائے۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں:

خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

بلاشبہ مصنف نے کلامِ اقبال کی مدد سے خودی کے مختلف پہلوؤں کی بخوبی وضاحت کی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے فلسفۂ خودی کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خودی، کشمکش حیات میں انسانی آزادی اور بقائے دوام کے ضمن میں انسان کی معاون ہے اور اُسے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں اُس کے لیے تقویت کا باعث بنتی ہے۔

خودی کی توضیح کے بعد، مصنف کا منتخب کردہ دوسرا اہم مبحث تصورِ مردِ کامل ہے۔ اُن کے مطابق اقبال کا مردِ مومن اُن تمام انسانی اور اخلاقی صفات سے متصف ہے جن کی نشان دہی قرآن حکیم اور سنتِ نبوی میں کی گئی ہے۔ پھر وہ قرآن اور حدیث سے اقبال کی شاعری کی مطابقت کی نشان دہی کرتے چلے گئے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال کے تصورِ شاہین کا تذکرہ بھی آیا ہے اور اقبال کے مردِ کامل اور نطشے کے سپر مین کا تقابل بھی کیا گیا ہے۔

عبدالرشید صدیقی خودی اور مردِ کامل کے تصورات کو اقبال کی شاعری کا نچوڑ قرار دیتے ہوئے اِن کا رابطہ اسلامی نشاتِ ثانیہ کی اس تحریک سے قائم کرتے ہیں جس کی ایک منزل قیامِ پاکستان ہے۔ اُن کے نزدیک اقبال کے ہاں فکری ارتقا اور غیر معمولی سیاسی بصیرت کا منطقی نتیجہ تصورِ پاکستان کی شکل میں سامنے آیا، جس نے آگے چل کر برعظیم میں پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ، آزاد ریاست کی شکل اختیار کی۔ تاہم مصنف کہتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی تعلیمات پر مبنی جس جمہوری اور ترقی پسند معاشرے کا خواب دیکھا تھا، اُس کی تعبیر ہنوز باقی ہے۔ (ص ۲۱)

کتاب کے آخری حصے میں بالِ جبریل کی نظم ''ساقی نامہ'' اور اقبال پر ایک سوانحی شذرہ شامل ہے۔

مصنف نے فکرِ اقبال کی توضیح کے لیے سادہ اور سہل اُسلوب اختیار کیا ہے جو بجا طور پر نوجوانوں کے لیے تفہیم اقبال میں معاون ثابت ہوگا۔ قارئین کو اقبال کی شاعری سے مانوس کرنے اور اس طرح انھیں مفکر شاعر سے قریب تر لانے کے لیے جابجا اشعارِ اقبال کی مثالیں دی ہیں۔ مولف نے بڑی کاوش سے اردو/فارسی شعروں کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی شامل کیا ہے۔ اپنے موضوع پر ہر اچھی اور معیاری کتاب کی طرح، اس کتاب میں بھی کتابیات، توضیح الفاظ اور اشاریوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ——ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

☆☆☆

Problem of Eevil in Muslim Philosophy : A Case Study of Iqbal ڈاکٹر محمد معروف شاہ۔ ناشر: انڈین پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، ۱۵۶، ڈی کملانگر، دہلی، بھارت ۔ ۲۰۰۷ء، صفحات ۱۹۴، قیمت ۔/۳۹۵ روپے۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب Introduction میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ نام نہاد دورِ جدید کے مفکرین نے Evil (بدی) سے کیا مراد لی ہے؟ مصنف کے نزدیک برائی یا بدی اور

مصائب و آلام سب ایک ہی لفظ Evil کے دائرے میں آتے ہیں اور جدید دور کے مفکرین کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ دنیا کے منظر نامے میں انسان کے تجربے میں آنے والے Evils اس حقیقت کو واضح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مقدمے اور نتیجے میں جو عقلی ربط پایا جاتا ہے، اس کا کوئی نام ہونا چاہیے جسے مصنف نے بیان نہیں کیا۔ پہلے باب میں مختلف اقوال نقل کر کے ان کی صحت کا جائزہ لیے بغیر مذہب اور مذہبی حقائق کو گونگا بہرا ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مذاہب کے تصورات میں مقارنت بلکہ عینیت کا دعویٰ کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے مذہب کی منطق پر شعوری محنت کرنے سے اِعراض برتا ہے۔

دوسرے باب A Brief Overview of Muslim Philosophy to Problem of Evil میں مسلم فکر میں Evil کی مشکل کا مختصر تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ اشاعرہ اور معتزلہ کے تجزیے سے بالکل واضح نظر آتا ہے کہ مصنف نے بنیادی ماخذوں تک رسائی حاصل نہیں کی۔ دوسری بات جسے مصنف نے بار بار دہرایا ہے، جدید مغرب کی وہ سوچ ہے جو خدا اور خدائی نظام سے باغی ہے مگر وہ یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ انسان اپنی محدود عقل پر مبنی لامحدود سوالات فقط اسی وقت اٹھاتا ہے جب اس کا اپنے محدود وسائلِ علم سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نظری تشکیل سے پیدا ہونے والی مشکل فقط اسی وقت جائز اور درست ہوسکتی ہے جب یہ مفروضہ قبول کر لیا جائے کہ نظری تشکیل اپنے متوازی حقیقت بالکل ویسے ہی رکھتی ہو جیسی کہ نظری تشکیل میں متشکل ہوتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ شعور مذہبی میں جس ذات کو خدا تعالیٰ کہا گیا ہے اس کے علم، قدرت، حکمت، ارادہ، تخلیق وغیرہ پر ایمان رکھا جاتا ہے اور دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی توجیہ کی دنیوی وجوہات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر معروف شاہ کے نزدیک Evil کی جتنی انواع ہیں، ان کے وقوع پذیر ہونے کی مادی وجوہات سے انسانی علم و شعور مطمئن ہو جاتا ہے تو ماورائی حقائق کا انکار یا اقرار کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟ مصنف نے دو اہم ترین اصولوں کو بری طرح پامال کر کے جن اوہام کو فکر جدید سے تعبیر کیا ہے وہ نہ تو نظری منطق پر پورے اترتے ہیں اور نہ مذہبی منطق سے جواز پاتے ہیں۔

اشاعرہ اور معتزلہ کے موقف پر مصنف کی تنقید سطحی اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ اشاعرہ نے ارادۂ ایزدی کو پہلے مرحلے پر ہی انسانی ارادے سے متمیز کیا ہے۔ اس لیے ارادۂ ایزدی انسانی ارادے کی تحدیدات سے ماورا ہے اور یہی مذہبی شعور کی بنیادی ضرورت ہے۔

شوان کے نقطۂ نظر کو بہت اہم بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر مصنف نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ شعور

مذہبی کو ان نظری تناقضات سے کوئی سروکار نہیں ہے جن پر شعورِ نظری کی پوری منطق ایستادہ ہے۔ شعور مذہبی کا اعلیٰ ترین نمونہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے ہاں کل اور جز کی یہ تقسیم کبھی نہیں کی گئی جسے شوان نے مذہبی حقائق کی قابل اعتماد توجیہ سمجھ کر پیش کیا ہے حالانکہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا تھا کہ کُل اور جز میں باہمی ربط منقطع ہوئے بغیر کُل کُل نہیں بن سکتا اور جز جز نہیں بن سکتا، بعینہٖ مصنف کی بھی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ شوان نے جس التباس میں پڑ کر اس مذہبی حقیقت کو نظری منطق کے جن ہیاکل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے وہ قدیم متکلمین کی منطق سے کہیں زیادہ عقل و فکر کی بنیادی ضرورتوں سے بعید ہیں۔

باب کے آخر میں اقبال اور جمال خواجہ کے نقطۂ نظر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب Iqbal's Approach to the Problem of Evil اقبال کے فکر وفلسفے میں Evil کی مشکل سے متعلق ہے۔ مصنف نے جو عمومی تاثر قائم کیا ہے وہ قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی اس دعوے کو قبول کر لے کہ اقبال کا فکر مغربی مفکرین کی عطا ہے اور یہ کہ اقبال بری طرح ناکام فلسفی ہے جو اپنے فلسفے کے بنیادی ماخذوں سے بے وفائی کر کے ایک ناقص اور نا تمام عمارت کو تعمیر کرنے کے درپے رہا ہے۔

اس باب کے آغاز میں مصنف نے جو فرمایا ہے، اس سے ان کے فہم وادراک کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں:

> All religion is an attempt to respond to this problem. (p.52)

کیا مذہب کی فقط یہی غرض و غایت ہے؟ کیا واقعتاً ادب اور اس سے وابستہ جمالیات فقط قبح و شر کی وجہ سے کوئی معنی رکھتے ہیں؟ کیا اقبال کے فکر وفلسفے کے لیے جذبۂ محرک فقط بدی کا وجود ہے؟ جیسا کہ مصنف نے پورے طمطراق سے لکھا ہے:

> His whole philosophy of ego and love could be interpreted as a response to the problem of evil in a broader sense. His hope in the ultimate victory of good over evil is essentially a religious solution to this problem which believed on faith but could not logically and rationally prove. (p.52)

مندرجہ بالا عبارت کے دوسرے جملے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس باب میں مزید کیا بیان ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو خود Problem of evil کی Logic اور Rationality کو ثابت کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی Logic اور Rationality سے یہ مسئلہ واقعتاً یہ صورت اختیار کر سکتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی مذہب، کلام، فلسفہ و ادب قائم نہیں رہ سکتے تو پھر اس منطق اور عقلیت کو ہی تمام انسانی اقدار پر فوقیت حاصل رہے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ مصنف یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ تمام انسانی اقدار و فضائل کو کسی ایسی منطق کی نذر کر دیا جائے جس میں انسان خود بدی کا نمونہ بن جائے۔ اور اس کا پورا ماحول بدکاری اور معصیت انگیزی سے لبریز ہو جائے۔

فلسفے کی ایک اصطلاح ہے جسے Misuse of Categories کہا جاتا ہے یعنی مقولات کا ناروا استعمال۔

انسانی تجربے کی دنیا لامحدود مظاہروں سے اٹی پڑی ہے۔ جمادات اور نباتات، حیوانات اور انسان گوناگوں مظاہر ہیں۔ ہم انسان اپنے شعور کے تحقق کے لیے ہر ہر مظہر کو الگ الگ بیان کرتے ہیں اور اس لیے الگ الگ بیان کرتے ہیں تاکہ وہ الگ الگ رہیں۔ فقط ایک لفظ سے تمام مظاہر کی توجیہ کو اضطراری توجیہ یا توجیہ بالجبر تو کہا جاسکتا ہے مگر وہ درست کبھی نہیں ہوگی۔ اور ایک ہی مظہر کو سب کچھ کہہ دینا نہ کوئی علمی بات ہے اور نہ فکری موقف ہے۔ مصنف نے ''شر'' کے وجود کو اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ انسان اپنی وجودی سطح پر نہ خیر کا تصور کرسکتا ہے اور نہ خیر کا جواز پیش کرسکتا ہے۔

اسی باب میں اقبال کا تقابل شوان سے کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں فکر اقبال کے ماخذ بیان کرتے ہوئے یہ خیال نہیں رکھا گیا کہ فکر کے باب میں ظاہری مماثلتیں اتنی اہم نہیں ہوتیں کہ غایتِ فکر بے معنی ہوکر رہ جائے۔

مصنف نے متعدد لوگوں کی آرا کو جمع کر دیا ہے اور مذہب کے بنیادی وجدان کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے غیر ضروری خیالات حتمی صداقتوں کے طور پر پیش کیے ہیں کہ قاری کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ مذہب، انسانی وجدان میں کوئی صداقت ہے یا پھر محض فریب فکر و فہم ہے۔ مصنف نے الزام لگایا ہے کہ فکر اقبال اشعری و معتزلی اور جدید افکار کا ملغوبہ ہے۔ اگرچہ وہ اس کی قابل فہم تشکیل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں (ص ۷۷) پھر شوان کے خیالات کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اقبال کا فکر بھی شوان کی تنقید کی زد میں ہے (ص ۷۸)۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مصنف نے نہ صرف اقبال کی فکر کو سمجھنے میں سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ شوان کے محرکاتِ فکر سے بھی پوری طرح باخبر ہونے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ علاوہ ازیں شوان کے نقطۂ نظر میں کیا یہ خوبی موجود ہے کہ ہماری مسلم روایت فکر اسے اپنے اندر جذب کرلے۔ جب کہ مصنف نے بار بار اس بات کو دہرایا ہے کہ اقبال کی فکر مسلم روایتِ فکر کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ بایں ہمہ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنف نے اقبال کے نقطۂ نظر کا جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

چوتھا باب Pantheistic Response to Evil and Iqbal کے عنوان سے ہے۔ اس میں بھی مصنف نے اپنے طرز تحریر کو برقرار رکھتے ہوئے اقبال کی فکر کا جائزہ ایک اور انداز سے لیا ہے۔

پانچواں باب Concluding Remarks کے عنوان سے خاتمۂ کتاب ہے۔

اس باب میں اقبال کے تقریباً پورے فکر کا ایک عمومی سا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں بھی مصنف نے شوان کو مذہبی فکر میں سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ باب کے آغاز سے اندازہ ہوتا ہے جیسے مصنف نے اقبال کے ہاں شر کے مسئلے تک اپنے مطالعے کو محدود رکھا ہے مگر آگے چل کر اس کے علاوہ دیگر مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ماحصل کا باب ہے اس لیے محض ''شر'' سے ہی وابستہ نتائج فکر پر بات کی جاتی تو بہتر تھا۔ بہرحال ایسا ممکن نظر نہیں آتا کہ فقط اس باب کے پڑھ لینے سے مصنف کے نقطۂ نظر کی اجمالی صورت سامنے آسکے۔

مجموعی طور پر ایک قاری جو فکر و فلسفے سے دلچسپی رکھتا ہو، اس کے لیے کتاب کی ایک اہم خوبی اچھی انگریزی نثر کی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف کے اس رجحان کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ ان کے پاس حوالے کے لیے بہت ریکارڈ موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی چاہے کہ وہ یہ سمجھے کہ مصنف کا اپنا موقف کیا ہے تو اسے اس کڑوے سچ کے ساتھ مصنف کے موقف تک رسائی حاصل کرنا پڑتی ہے کہ ان کا اپنا موقف تنقید کے اصول پر پرکھا ہوا نہیں ہے اور وہ اقبال پر جس کڑی تنقید سے حملہ آور ہوتے ہیں، اس تنقید کی تلوار سے خود اپنے آپ کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے پیش نظر اقبال کا دفاع کرنا نہیں ہے، بلکہ فقط کتاب کے مندرجات کی نسبت یہ بیان کرنا ہے کہ مصنف کس حد تک ان اصولوں کی پابندی کرتے ہیں جن سے وہ دوسروں کو پرکھتے ہیں۔ محمد خضر یاسین

☆☆☆

اقبال کا تیسرا خطبہ: تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ڈاکٹر محمد آصف اعوان۔ ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد، رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، ۲۰۰۶ء، صفحات ۲۴۷، قیمت ۔/۲۰۰ روپے۔

علامہ کا تیسرا خطبہ ''تصور خدا اور دعا کا مفہوم'' ہے۔ اس خطبے کا توضیحی مطالعہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ پہلے تصورِ خدا کو بیان کیا جائے اور ممکن ہو تو اس پر تنقید کر دی جائے تاکہ پورا تصور واضح ہو جائے۔ مصنف نے جو طریق اختیار کیا ہے وہ بڑی حد تک Academic ہے۔ انھوں نے پورے تصور سے تعرض کیے بغیر ایک ایک جملے کو دوبارہ عبارت کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں تحقیقی مطالعے کی صورت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اقبال نے جن علما کے حوالے دیے ہیں ان میں سے چند کی اصل عبارتوں کو نقل کر دیا گیا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ کتاب فکر اقبال کی توضیح پیش کرنے کے باب میں کوئی خاطر خواہ اضافے کا باعث نہیں ہے۔ کیونکہ مصنف نے اقبال کی عبارتوں کی وضاحت کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن فکر اقبال کے کلی نظام میں دخیل ہونے کی سعی نہیں کی۔ علاوہ ازیں بعض مقامات پر اقبال کی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ مثلاً اقبال نے کبھی نہ یہ کہا ہے اور نہ کہہ سکتے ہیں کہ وجود دراصل فکر کی تجسیمی صورت ہے یا دنیا کے وجود کا ارتقا فکر کے ارتقا کے ساتھ وابستہ ہے (ص ۱۹)۔

اسی طرح اس خطبے میں جتنے مسائل بیان کیے گئے ہیں ان سے تصور خدا قائم کرنے میں فکری سطح پر کیا معاونت حاصل ہوتی ہے مصنف کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے وہ بس سامنے کی عبارت لے کر اس کا اپنی حد تک مفہوم تحریر کر دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تحقیق اور توضیح میں ایسا طریق کار آمد نہیں ہو سکتا۔ کتاب پر متعدد اہل علم نے توصیفی آرا کا اظہار کیا ہے۔ معلوم نہیں یہ آرا لکھتے وقت مذکورہ بالا پہلو اُن کی نظروں سے کیوں اوجھل ہو گئے۔ — محمد خضر یاسین

☆☆☆

چوں مرگ آید، ڈاکٹر تقی عابدی۔ ناشر اقبال اکادمی پاکستان، چھٹی منزل، ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء، صفحات ۲۰۶، قیمت ۔/۱۵۰ روپے۔

اقبال کی شخصیت اور شاعری کے یوں تو بہت سے پہلو ہیں اور پچھلے تقریباً سو برسوں سے ان پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے گوشے ابھی پوشیدہ ہیں۔ ناقدین اور اقبال شناسوں نے ان کی شاعری، خطوط، شخصیت، مزاج، خطبات اور حسِ مزاح سے لے کر ان کی زندگی کے مثبت و منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، حتیٰ کہ معاصر شعرا نے اقبال کی شاعری پر اعتراضات بھی اٹھائے ہیں اور ناقدین نے ان اعتراضات کے مکمل وضاحت کے ساتھ جوابات بھی دیے ہیں لیکن اقبال کی زندگی میں آنے والی بیماریوں اور مرض الموت میں مبتلا ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملنے کی حقیقی داستان بہت کم لوگوں نے رقم کی ہے۔ اس حقیقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کچھ عرصہ قبل اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص کے حوالے سے منظرِ عام پر آنے والی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب چوں مرگ آید اس لحاظ سے ایک منفرد کاوش ہے کہ اس سے پہلے اقبال کی بیماریوں اور ان کی تشخیص اور علاج کے بارے میں کوئی مستند کتاب موجود نہیں تھی۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شاعر کی طویل علالت اور مرض الموت میں مبتلا رہنے کی لحہ بہ لحہ روداد شامل ہے۔

یہ کتاب اقبال کے بیمار ہونے سے لے کر موت تک کے واقعات کی مکمل سرگذشت ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک انتہائی اہم کتاب ہے۔ اگرچہ اقبال شناسوں اور ان کے چاہنے والوں کے لیے کتاب کا مطالعہ بہت سے حقائق جان لینے کے ساتھ ساتھ انتہائی اذیت اور دکھ کا باعث بھی ہے کہ شاعرِ مشرق اپنی زندگی میں کیسی کیسی موذی بیماریوں سے نبرد آزما رہے اور آخرکار موت نے انھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا، لیکن تمام عمر حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی اقبال نے اپنے آپ کو مایوس نہیں ہونے دیا اور ایک عزم اور اُمید سے بیماریوں کے خلاف لڑتے رہے اور ان بیماریوں کی شدت کو زائل کرنے کے لیے استقامت سے ڈٹے رہے۔

کتاب میں اقبال کی بیماریوں کے نام، میڈیکل معائنہ، ٹیسٹ اور طبی آلات کا ذکر ہے۔ اقبال کے تیس معالجین کی فہرست بھی شامل ہے۔ اقبال کے مرض کی تشخیص اور علاج میں ہونے والی کوتاہیوں پر مختصر مگر جامع طور پر لکھا گیا ہے۔ اس وقت کے اعتبار سے اقبال کا بہترین علاج کیا گیا لیکن تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ اقبال کے معالجین نے سختی سے انھیں نہ تو کسی پرہیز پر مجبور کیا اور نہ دواؤں، کشتوں اور برقی کورس کی وجہ سے صحت پر پڑنے والے منفی اثرات کو کنٹرول کر سکے۔ اس سے اگلا باب ''خوراک اور پرہیز'' ہے جہاں اقبال کے خطوط اور مستند حوالوں سے یہ بات منظرِ عام پر آئی ہے کہ شاعرِ مشرق کھانے میں

نفاست پسند اور کم خور ہونے کے باوجود تیز نمک مرچ، ترش، چٹ پٹی، اور مرغن غذاؤں کے شوقین بھی تھے۔ اپنی پسندیدہ چیزیں کھانے کی وجہ سے وہ بعض اوقات خوش خوراکی کا مظاہرہ کرتے اور ہر طرح کی پرہیز چھوڑ دیتے تھے جس کی وجہ سے بیماریوں سے افاقہ ہونے کی بجائے اُن میں اضافہ ہوجاتا تھا۔

اس کتاب میں اقبال کے زیرِ استعمال رہنے والی دواؤں کے نام بھی شامل ہیں اور دواؤں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوگیا ہے جو مختلف موقعوں پر لوگوں نے پھیلا رکھی تھیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کتاب مدلل انداز سے اقبال کی ذات پر اُٹھنے والے منفی سوالات کا محاکمہ بھی کرتی ہے۔ کتاب کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں مصنف نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ کیا اقبال نے بیس سال کم عمر پائی تھی؟ اس بات کی تصدیق کے طور پر انھوں نے اقبال کی موت کی وجوہات اور اسباب بھی بیان کیے ہیں اور اقبال کے خاندان کے افراد کی عمریں بھی تحریر فرمائی ہیں۔ چند حادثاتی اموات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اقبال اپنے قریبی رشتہ داروں میں سب سے کم عمر تھے اور انھوں نے اپنے دوسرے عزیزوں کے مقابلے میں پندرہ سے بیس سال کم عمر پائی۔

یوں تو کتاب کا ایک ایک صفحہ اقبال شناسوں کو پڑھنا چاہیے لیکن ان موضوعات میں سے استقامت اور اُمید، گزارشِ امراض۔ اقبال کے قلم سے اور علامہ اقبال کی آخری رات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ استقامت اور امید کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال کے عقیدے میں نا اُمیدی کفر تھی اور بقول مصنف استقامت و توکل ان کا ایمان تھا۔ ان کی زندگی میں مشکل سے مشکل مواقع بھی آئے جن میں انھوں نے انھی طریقوں سے فتح حاصل کی۔

اسی طرح گزارشِ امراض میں اقبال کے ۲۵۱ خطوط کا ذکر ہے جن میں انھوں نے اپنی بیماریوں کا ذکر کیا۔ بقول مصنف وہ اُردو ادب کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے بذریعہ خطوط اپنی بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

——خالد اقبال یاسر

☆☆☆

مقائسہ ارمغانِ حجاز، فارسی، ڈاکٹر بصیرہ عنبرین۔ ناشر: بزمِ اقبال، ۲ کلب روڈ، لاہور، صفحات ۱۹۲، قیمت ۱۵۰/- روپے۔

ارمغان حجاز علامہ کا آخری شعری مجموعہ ہے، اس کے دو حصے ہیں اُردو اور فارسی۔ زیرِ نظر کتاب فارسی حصے کی تحقیق سے متعلق ہے۔ اس میں اقبال کی قلمی بیاض اور مطبوعہ نسخوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے اور متنِ اقبال کی ترمیمات اور متروکات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کے ایم اے فارسی کا مقالہ ہے۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے رباعی اور دوبیتی میں فرق کو موضوع بنایا ہے۔اس میں رباعی اور دوبیتی کے اوزان و بحور پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف حوالوں سے رباعی کے لیے لاحول ولا قوۃ الا باللہ (مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع) کی بحر مخصوص قرار دی ہے۔ یہ بحر ہزج کہلاتی ہے اور اس کے چوبیس مختلف اوزان مخصوص ہیں۔ان کے نزدیک رباعی کے لیے ہر مصرع چہار رکنی ہونا چاہیے اور دوبیتی کے لیے سہ رکنی تاہم دوبیتی بھی بحر ہزج میں لکھی جاتی ہے۔معروف علماے ادب اور بابا طاہر عریاں کی شاعری سے ۸۸ حوالوں اور حواشی سے انھوں نے رباعی اور دوبیتی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

دوسرے باب ''اقبال کی دوبیتی — ایک تحقیقی مطالعہ'' میں وہ کہتی ہیں: ''شعرِ اقبال میں رباعیات کے تحت مرقوم دو بیتیاں رباعی کے مروجہ نظامِ اوزان اور شرائط و قیود سے مکمل طور پر انحراف کر کے خود اپنا ایک نظام تشکیل دیتی ہیں۔''

اوزان و بحور کی بنا پر رباعی اور دوبیتی کے سبب مصنفہ کے خیال میں اقبال کے ہاں رباعیات کی تعداد بہت کم ہے اور رباعیات کے زیرعنوان لکھی جانے والی اُردو اور فارسی دوبیتیوں کی تعداد ۶۱۱ بنتی ہے۔

یوں پہلے دو ابواب کا تعلق ایک ہی موضوع سے ہے جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اقبال نے بابا طاہر کے سوز و گداز، نغمگی اور روانی سے متاثر ہو کر ان کے تتبع میں جو کچھ لکھا، وہ رباعیات نہیں بلکہ دوبیتیاں ہیں۔ صوفی غلام محی الدین کے نام ۲۴ مئی ۱۹۳۲ء کے خط میں اقبال نے کہا ہے کہ یہ رباعی کے مخصوص اوزان میں نہیں ہیں۔البتہ انھیں رباعی کہنے میں مضائقہ نہیں۔اقبال نے متعدد جگہوں پر انھیں رباعیات ہی کہا ہے۔

تیسرے باب میں ارمغانِ حجاز کی بیاض اور مطبوعہ نسخوں کا تقابلی جائزہ ہے۔اس میں ایسی دو بیتیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو متروک و مسترد ہونے کے باوجود ارمغانِ حجاز میں شامل ہیں۔اسی طرح ایسی دو بیتیاں جن کا متن واضح طور پر بیاض سے مختلف ہے یا بعض بیاض میں شامل نہیں وہ بھی موجود ہیں۔

چوتھا باب ترمیماتِ ارمغانِ حجاز سے بحث کرتا ہے۔اس باب میں مصنفہ نے اقبال کی دست نوشت ترمیمات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ بیاض میں جن مصاریع یا اشعار میں اقبال نے ترمیم یا تبدیلی کی، انھیں زیرِنظر باب میں درج کیا گیا ہے۔

پانچواں باب باقیاتِ ارمغانِ حجاز سے متعلق ہے۔اس میں بیاض اور ۱۹۳۸ء کے مطبوعہ نسخے کا موازنہ کرتے ہوئے ان دوبیتیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں۔

کتاب کے آخر میں اقبال کی دست نوشت رباعیات کے نمونے دیے گئے ہیں۔

اقبال کی تفہیم اور فکری ارتقا کے ادراک کے لیے ان کی بیاضوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ارمغانِ حجاز کے حوالے سے یہ مطالعہ اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کیوں کہ دیگر شعری مجموعے تو اقبال کی زندگی میں

خود انھی کے ہاتھوں مرتب ہوکر شائع ہو گئے تھے، مگر ارمغان حجاز کو ترتیب دینے کی مہلت انھیں نہیں ملی۔

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کی یہ تحقیقی کاوش بلاشبہ تحقیق متنِ اقبالیات کا ایک عمدہ نمونہ اور اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اقبال کے فارسی متن پر یہ اپنی نوعیت کا پہلا تحقیقی کام ہے۔ یہ کتاب اقبالیات کے طلبہ اور سکالروں کے لیے حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ کتاب کی طباعت و پیش کش ناشر کے حسنِ ذوق کی عکاس ہے۔

—— قاسم محمود احمد

☆☆☆

اشاریۂ معارف اعظم گڑھ، محمد سہیل شفیق۔ ناشر: قرطاس، کراچی، ۲۰۰۶ء، صفحات ۶۴۴، قیمت ۵۵۰/- روپے، مجلد، مجلّاتی سائز۔

معارف اپنے علمی و تحقیقی معیار کے اعتبار سے اردو کا ایک نمایاں مجلّہ ہے۔ علامہ شبلی نعمانی (م: ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء) ندوۃ العلما لکھنؤ سے قطع تعلق کر کے جب اپنے آبائی شہر اعظم گڑھ آئے تو انھوں نے ایک علمی و تحقیقی ادارے اور ایک کتب خانے کے قیام اور ایک علمی مجلّے کے اجرا کا خواب دیکھا تھا، جو اُن کی زندگی میں تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، تاہم ۱۹۱۴ء کے اواخر میں ان کے تلامذہ و معتقدین نے دارالمصنفین کے نام سے علمی و تحقیقی ادارہ قائم کر لیا، جس میں تصنیف و تالیف اور ترجمے کے ساتھ ساتھ، ایک علمی ماہ نامے کے اجرا کا فیصلہ بھی کیا گیا، چناں چہ سید سلیمان ندوی (۱۲/دسمبر ۱۸۸۴ء - ۲۲/نومبر ۱۹۵۳ء) نے رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ بمطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں علامہ شبلی نعمانی کی خواہش کے مطابق معارف کا پہلا شمارہ مرتب کر کے اعظم گڑھ سے شائع کر دیا، جس کے مقاصد میں سے بقول مرتب: ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی تاریخ مرتب کی جائے اور اسے جدید اسلوب و انداز میں پیش کیا جائے۔

پرچے کے بانی مدیر سید سلیمان ندوی نے معارف میں خود بھی تاریخ اسلام، بالخصوص ہندوستان کی تاریخ کے علمی، تمدنی اور تہذیبی پہلوؤں پر مقالات لکھے، مستشرقین اور ان کے ہم نوا مؤرخین کی دروغ گوئی کی تردید کی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے رفقا کے علاوہ ملک کے دوسرے اہل علم کے تحقیقی کارناموں سے قارئین کو رُوشناس کرایا۔ اس پرچے کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا: صرف یہی ایک [قابلِ ذکر] پرچہ ہے، اَور ہر طرف سناٹا ہے۔ الحمدللہ! مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائگاں نہیں گئیں اور صرف آپ [سلیمان ندوی] کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی، جو خدمتِ علم و تصنیف کے لیے وقف ہے۔ عالمِ اسلام کے عظیم دانش ور اور مؤرخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نزدیک: واقعہ تو یہ ہے کہ آج کل ساری دنیاے اسلام میں، عرب ہو کہ عجم، کوئی اسلامی رسالہ اسلامیات پر اعظم گڑھ والے معارف کے معیار کا

نہیں، اَوروں کے ہاں کاغذ اور طباعت بہتر ہوسکتی ہے، لیکن مضامین کے مندرجات میں علمی معیار بدقسمتی سے کچھ بھی نہیں۔ خدا معارف کو سلامت باکرامت رکھے۔ مَیں خود معارف میں جگہ پاؤں تو اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتا ہوں۔

معارف کے مدیران کے تعارُف سے پرچے کے آیندہ سفر اور اس کے علمی، تحقیقی اور ادبی معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ معارف کے شاندار ماضی، قابلِ ذکر حال اور تابناک مستقبل میں اس کے فاضل مدیران، یعنی سید سلیمان ندوی (۱۹۱۶ء تا ۱۹۴۹ء)، شاہ معین الدین احمد ندوی (۱۹۴۹ء تا ۱۹۷۴ء)، عبدالسلام قدوائی ندوی (۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۹ء) سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۷ء)، ضیاء الدین احمد اصلاحی (۱۹۸۷ء تا حال) کی شبانہ روز دیانت دارانہ سعی جمیلہ کا بہت بڑا کردار ہے۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے نزدیک معارف کا فیضان آج بھی اپنی قدیم روایات کے ساتھ جاری ہے۔ اسے بجا طور پر علومِ اسلامیہ کی اردو انسائی کلوپیڈیا کا نام دیا جاتا ہے، کیوں کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو تحقیقی سرمایہ، صرف معارف نے پیش کیا ہے، اگر اسے جمع کیا جائے تو سیکڑوں معرکہ آرا کتابیں شائع ہوسکتی ہیں۔ تاریخ اسلام اور اسلامی علوم وفنون کا شاید ہی کوئی پہلو یا تذکرہ ہو، جو معارف کے صفحات میں اجاگر نہ کیا گیا ہو۔

معارف کے مستقل اور مثبت کردار کے پیش نظر ضروری تھا کہ اس کا ایک اشاریہ ترتیب دیا جائے۔ زیرنظر اشاریے سے پہلے بھی چار جزوی اشاریے مرتب کیے جا چکے ہیں۔ لیکن کوئی اشاریہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ مبارک باد کے مستحق ہیں اس اشاریے کے مرتب کہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی قیمت پر انھوں نے معارف کا یہ اشاریہ ترتیب دیا اور تشنگانِ علم وآگہی کی پیاس بجھانے کا سامان بہم پہنچایا۔

اس اشاریے کا مقدمہ مقالے کی نگران ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر نے لکھا ہے اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے مقدمہ لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ معارف کے اجرا کے سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر و تکمیل کرنے میں سید سلیمان ندوی کے کردار، معارف کے اجرا اور اس کی نوے سالہ تاریخ، مدیران کے تعارف اور ان کے کارناموں، اردو کی دینی صحافت میں معارف کے کردار، معارف کے مختلف اشاریوں اور محمد سہیل شفیق کی لگن اور جستجو کے متعلق انھوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مرتب نے اس اشاریے کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں صفحہ نمبر ۲۳ سے صفحہ نمبر ۲۱۱ تک زمانی اعتبار سے ایک سو پچھتّر جلدوں کے چار ہزار تین سو پچانوے مقالات کی فہرست دی گئی ہے، جس میں جلد نمبر، عدد (شمارہ نمبر)، تاریخ (عیسوی و ہجری ماہ وسال)، موضوع، مصنف اور اُس کتب خانے کا اندراج کیا گیا ہے، جہاں یہ شمارہ یقینی طور پر موجود ہے۔ کتب خانے کے مکمل نام کے بجائے مخففات سے کام لیا گیا ہے، جن کی وضاحت اشاریے کے آخری صفحے پر کر دی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں مقالات کو چھتیس مختلف موضوعات کے تحت صفحہ ۲۱۵ سے ۲۶۷ تک زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں مختلف موضوعات کے تحت مضامین و مقالات کے اندراج کے سامنے جلد نمبر اور کولن (:) کے بعد شمارہ نمبر دیا گیا ہے۔ ایک مضمون کو دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے درمیان میں سکتہ (،) لگایا گیا ہے، جب کہ کسی مقالے کا ایک سے زائد موضوعات سے تعلق ہونے کی صورت میں اسے متعلقہ تمام موضوعات میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس اشاریے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرچے میں سب سے کم مضامین اقتصادیات کی ذیل میں شائع ہوئے، یعنی آٹھ؛ جب کہ سب سے زیادہ شخصیات کے ضمن میں، یعنی چھے سو تہتر۔ اس باب میں مختلف موضوعات کے تحت مضامین کو زمانی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اسے الف بائی ترتیب سے درج کیا جانا چاہیے تھا، تاکہ قاری کسی معلومہ مضمون کے شمارے تک بآسانی رسائی حاصل کر سکتا۔

تیسرا حصہ صفحہ ۲۷۱ سے ۲۹۴ تک محیط ہے، جو الف بائی ترتیب سے آٹھ سو انہتر مصنفین کے اشاریے پر مشتمل ہے۔ اس میں مقالہ نگاروں کے نام کے سامنے ان کے مطبوعہ مقالات کے حوالے سے جلد نمبر اور شمارہ نمبر درج کیا گیا ہے۔

صفحہ ۲۹۷ سے ۵۳۲ تک پھیلے ہوئے چوتھے حصے میں زمانی اعتبار سے تبصرہ شدہ کتب کی فہرست دی گئی ہے۔ اس میں جلد نمبر، شمارہ نمبر، عیسوی و ہجری ماہ و سال، کتاب کا نام، مصنف/مؤلف/مترجم/مرتب کا نام، کتاب کے ناشر اور شہر کا نام اور آخر میں کتاب کے صفحات کا اندراج کیا گیا ہے، تاہم مبصرین سے شناسائی نہیں ہوتی، جس کی ایک وجہ غالباً پرچے میں مبصرین کے لیے بالعموم مخففات کا استعمال ہے۔

الف بائی ترتیب سے چار ہزار تین سو تہتر تبصرہ شدہ کتب کی فہرست صفحہ ۵۳۵ سے ۶۲۱ تک پانچویں حصے میں پیش کی گئی ہے۔ یہاں کتاب کے نام کے سامنے جلد نمبر اور شمارہ نمبر تحریر کیا گیا ہے۔

درج بالا دونوں ابواب میں تبصرہ شدہ کتب کی زمانی اور الف بائی ترتیب دی گئی ہے، تاہم تبصرہ شدہ کتب کے مصنفین، مبصرین اور ناشرین کے اشاریے کی کمی کھٹکتی ہے۔ اگرچہ کسی بھی تحقیق کی کچھ نہ کچھ حدود متعین کرنا ہی پڑتی ہیں اور محقق کسی دائرے میں رہتے ہوئے ہی کام کر سکتا ہے، تاہم اگر مبصرین اور ناشرین کا اشاریہ غیر ضروری سمجھا جائے تو بھی مصنفین کے اشاریے کی اہمیت سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چھٹے حصے میں صفحہ ۶۲۵ سے ۶۳۷ تک وفیات کا الف بائی اندراج کیا گیا ہے۔ اس میں دو سو اکسٹھ شخصیات کا تذکرہ ہے۔ اس حصے میں شخصیت، تاریخ پیدائش/عمر، تاریخ وفات، تذکرہ نگار، تاریخ اطلاع، معارف کی جلد اور شمارہ نمبر کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ساتویں باب میں معارف کے ایک ہزار اسّی شماروں میں جلد نمبر، ہجری ماہ و سال کے حوالے سے

پائے جانے والے ایک سو پانچ تسامحات کی تصحیح کی گئی ہے۔ محقق نے نہایت عرق ریزی سے ہجری ماہ وسال میں چوالیس، عیسوی ماہ وسال میں تین، جلد کے حوالے سے انسٹھ اور شماروں کے اندراج میں تین مقامات پر درآنے والی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔

آخری حصے میں کتب خانوں کے لیے استعمال کیے گئے مخففات کی وضاحت کی گئی ہے۔ کراچی کے کتب خانوں میں کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو پاکستان (ات اپ)، بہادر یار جنگ اکیڈمی لائبریری (ب ی ج ل)، شرف آباد بیدل لائبریری (ش ب ل)، کراچی یونی ورسٹی لائبریری (ک ی ل)، مشفق خواجہ لائبریری (م خ ل)، مجلس علمی لائبریری (م ع ل) اور ہمدرد یونی ورسٹی لائبریری (ہ م ل) شامل ہیں، علاوہ ازیں گوجرانوالہ میں عبدالمجید کھوکھر لائبریری (ع ک ل) اور دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (دش ا) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اس اشاریے میں جس قدر حسن وخوبی پائی جاتی ہے، اس میں مرتب کی لگن کے ساتھ ساتھ عطا خورشید اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کی رہنمائی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن کے مشورے کے بعد مرتب نے اشاریے میں تبصرہ شدہ کتب کو زمانی ترتیب سے درج کرنے کے علاوہ اس کا الف بائی انداز میں اشاریہ بھی مرتب کیا۔ مزید ڈاکٹر معین الدین عقیل کی ہدایت پر انھوں نے وفیات کو بھی شامل اشاریہ کیا۔ چناں چہ اس سے اشاریے کی افادیت اور قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ موجودہ حالت میں یہ کاوش اردو اشاریہ سازی کی تاریخ میں ایک عمدہ مثال کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے پیش نظر امید کی جانی چاہیے کہ جامعات میں ترتیب دیے جانے والے اشاریے اسی اعلیٰ علمی سطح کے حامل ہوں گے۔

سید معراج جامی کے خیال میں ''معارف کا یہ اشاریہ علم و ادب کی دنیا میں یقیناً وقیع اور کارآمد دستاویز کی حیثیت سے محققین اور علم کے جویا حضرات کے لیے مفید ثابت ہو گا۔'' (بحوالہ فلیپ) اس اشاریے کے مطالعے کے بعد مرتب کے علمی اخلاص اور محنت و کاوش کا اعتراف نہ کرنا علمی وسعتِ ظرفی کے خلاف ہے۔ یہ اشاریہ اپنی علمی وسعت اور حسن ترتیب کی بدولت مسافرانِ علم و ادب کو ہر مرحلے پر اپنی اہمیت و افادیت کا احساس دِلاتا رہے گا۔ ——ڈاکٹر خالد ندیم

☆☆☆